P. O. RGD. No. A 922

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے | سالانہ چندہ دو روپے

جلد ۱۱ | ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۵۲ء | مدیر قاضی عبدالغفار | ۲۶ صفر المظفر ۱۳۷۲ ہجری | نمبر ۲۰

کچھ اپنی باتیں

ادب میں گندگی کے بیوپاری

ایک نیا رسالہ ہمارے سامنے ہے جسکے مقاصد کی توضیح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ اس رسالہ کے:-

"ذریعہ عوام کو ہلکی پھلکی ادبی تفریح فراہم کی جائے اسکے مختلف النوع مضامین ہر چند کہ رنگین اور رومانی ہوں لیکن نفسیاتی طور پر ذہن و دماغ آن سے صالح اثر قبول کریں"............ وغیرہ وغیرہ

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"ہمارے فلمی اور غیر فلمی ماحول میں جو ارباب کاروان ہیں لوگ جس طرح ایک دوسرے کو دھوکہ دیتے ہیں لوٹتے ہیں، پیٹ اور جنس کی بھوک کے تقاضوں کو اخلاق کی بلند معیار قدروں کے پردہ میں چھپا کر انہیں رسوا کرتے ہیں، عوام کو دھوکہ دیتے ہیں، ان کے کرداروں سے فریب کی تہیں اتار دی جائیں اور ہماری آج کی سوسائٹی جسقدر کھوکھلی ہے آپ اسکے اصلی روپ میں عوام کے سامنے پیش کر دیا جائے"......

.... وغیرہ وغیرہ

اب یہ دیکھیئے کہ ان مقاصد کی تکمیل کس طرح شروع ہوتی ہے چند عبارتیں اور چند سرخیاں ملاحظہ ہوں:-

(۱) "............ اور .... رومان کا نیا دور۔ برسوں کی جدائی کے بعد پھر چوری چوری ملاقاتیں ہونے لگیں — .... کے دل میں روز بروز .... کے لئے بیتابی بڑھ رہی ہے .... دو ملاقاتوں کے بعد .... انتہائی مسرور، بہت شوخ اور بیحد خوش دکھلائی دیتی ہے۔ دیکھئے یہ ملاقاتیں کیا رنگ لاتی ہیں۔ امید تو یہی ہے کہ جلد ہی کوئی شگوفہ کھلیگا"

(۲) .... کے پیٹ میں کچھ گڑ بڑ ہوئی — .... کو بچہ دانی دنوں ہی پیٹ کی

کوئی بیماری ہو گئی تھی اور اب پھر اسکے پیٹ میں کچھہ گڑ بڑ جھالا معلوم ہوتا ہے .... جب اسکے کسی گھر والے سے کوئی اسکی بیماری کے متعلق پوچھتا ہے تو وہ کہدیتے ہیں کہ .... کا معدہ خراب ہے .... کچھہ کہو بھی لوگ یہہ ضرور سوچ رہے ہیں اور وہ ہر شخص سے یہہ پوچھتے ہیں کہ آخر کچھہ مدت سے .... کے پیٹ میں بار بار یہہ تکلیف کیوں ہو جاتی ہے اور پھر یہہ تکلیف اسکے پیٹ ہی میں کیوں ہوتی ہے" ....

(۳) "........ کی ہون .... ہر محفل میں خواہ وہ کتنی مختصر اور معمولی کیوں نہ ہو خوب بن سنور کر بڑے طمطراق سے اس طرح شریک ہوتی ہے کہ ہر آدمی دل تھام کر رہ جاتا ہے .... ہسپتال میں .... کا اپنڈی سائیس کا اپریشن ہوا جسکی اطلاع بہت کم لوگوں کو ہوسکی اور پھر اسکے دس دن بعد ہی اس نے چلنا پھرنا شروع کردیا۔ یہہ کوئی اور راز تھا جسے ہسپتال میں دفن کردیا گیا" ....

(۴) ...... کا بدیسی عشق۔ "........ وہ دسمبر کے خنک رومانی پرور موسم میں لندن جانا چاہتی ہے تاکہ دل کی یہہ خلش باقی نہ رہے اور اس مرتبہ .... کے ساتھہ محبت کے کھیل بھی کھول کر کھیلے جاسکیں ...."

(۵) "........ اور .... کی شادی ۴ ستمبر کو ہو گئی۔ جس پر ہم انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں، لیکن شادی خلاف توقع اتنے قبل کیسے ہو گئی، منگنی کے وقت تو یہہ طے ہوا تھا کہ یہہ شادی نومبر میں ہوگی، اس کے متعلق کچھہ کہو بھی لوگوں کا بیان ہے کہ شائد ایک آنے والے خطرہ کی روک تھام کے لئے یہہ شادی قبل از وقت سرانجام پا گئی ہے---بمبئی کی گرمی سے گھبرا کر جون میں .... مسوری آئی تھی، تو اورا ہی .... کو بھی گرمی نے ستایا، اور وہ بھی پیچھے پیچھے مسوری آ پہونچا، اور بیناراۓ کے پڑوس میں سا ٹھہرا، وہاں ان دونوں کی خوب گاڑھی چھنی، رات دن ساتھہ رہتے، گھومتے پھرتے عیش کرتے، اور جب کبھی انہیں تنہائی کی ضرورت محسوس ہوتی تو قریب کے ایک سنسان مکان میں ڈیرہ جما دیتے اور یہہ رومان پرور تنہائی پاکر حسن و عشق ایک دوسرے میں جذب ہو جاتے۔۔ افواہ ہے کہ یہیں اس خطرہ کی داغ بیل پڑی، جس سے یہہ اندیشہ ہوا کہ کہیں آگے چل کر یہہ خطرناک نہ بن جائے اس برے وقت کو ٹالنے کے لئے یہہ شادی نومبر کے بجائے ستمبر کے اوائل ہی میں ہو گئی---!"

(۶) "ایک آراستہ کمرے میں جسکی ہر ہر چیز دعوت نشاط بانٹی گئی تھی........ اور خوش نصیب .... داد عیش دینے لگے۔ رات بھر طرب کی محفل جمی رہی اور منچلے نوجوانوں کا ہوس پرور خیال کمرہ کے در و دیوار کے اس طرف کھیلے جانے والے وصل کے ڈرامہ کو صاف صاف دیکھتا رہا کہ دونوں ایک دوسرے کے جسم سے، جسم کے ایک انگ انگ سے، انگ کی ایک اک رگ سے کس کس طرح جوانی کی شراب پیتے رہے، عیش کرتے رہے، اور مست ہوتے گئے، بالآخر خیریت سے رات گزری، صبح ہوئی صاحب نصیب .... تازہ رس پی کر آیا تھا اس کے چہرہ پر خوشی

کے خون کی دھاریاں لہرا رہی تھیں ....بڑی خوش تھی ـ وہ منھہ بند کلی سے کھلا ہوا پھول بن گئی تھی جوانی پر بہاروں کی رعنائیاں چھا گئی تھیں ـ عضو عضو میں لچک تھی، لوچ تھا، مستی تھی سرور تھا ـ اسے سب نے دیکھا ـ اور اس کی خوشی نے سب کے دلوں میں مسرت کی بجلیاں بھر دیں اماں خالہ نے بلائیں لیں "

(ی) "بازار حسن کی ایک رات" (سرخی)

یہہ چند ہی نمونے ہیں آپ مقاصد کی تکمیل کے جنکا ذکر شروع میں کیا گیا! ناظرین کے اخلاق کی اصلاح کا یہہ چٹ پٹا طریقہ اور یہہ "ہلکی پھلکی ادبی تفریح" اور اسکا "صالح اثر" کہاں تک سوسائٹی کی اصلاح میں کس قدر معاون ہوسکتا ہے اسکا اندازہ سوائے رسالہ کے اڈیٹر کے کوئی نہیں کرسکتا ـ ـ یہہ کے گندے پانی کو صاف کرنے کی یہہ کوشش جو بہت سے رسالہ پڑھنے والے نوجوان مرد اور عورتوں کے دامن کو گندہ کرتی ہو ایسی عجیب ہے کہ اسکی افادیت ہمارے وہم و خیال کے دایرے سے باہر ہے!

اور یہہ صرف ایک ہی رسالہ تو نہیں، کتنے ہی ایسے گندگی کے بیوپاری ہیں جو اردو ادب کو گندہ کر رہے ہیں ـ مذہب کے نام پر رسالہ شائع کرنے والوں کے صفحات پر بھی اب جنسی بیماریوں کی دواؤں کے عریاں اشتہار دیکھہ سکتے ہیں ـ یہہ حضرات اردو ادب کے بدترین دشمن ہیں جو پڑھنے والوں کے ادنےٰ جذبات کو بھڑکاتے ہیں اور اپنا رسالہ بیچ لیتے ہیں

ایسے اڈیٹروں کی سمجھہ میں یہہ بات بھی نہیں آتی کہ فلم کے آرٹ پر تنقید کرنے کے لئے اداکاروں کی شخصی زندگی کی اسقدر باریک اور گھناونی تفصیلات کو عریاں کرنا بالکل ضروری نہیں ہے اور کہیں بھی دنیا میں ان گندی نالیوں کے اندر اتنا گندہ پانی نہیں بہتا جتنا کہ چند سال سے اردو ادب کی ان اولتیوں سے گر رہا ہے!! کیسی شرم اور افسوس کی بات ہے کہ اُدھر تو اردو زبان موت و زیست کی کشاکش میں مبتلا ہے اور اودھر اسکے ادب میں یہہ گندگی ملائی جا رہی ہے! اور اسکا نام رکھا جاتا ہے "ہلکی پھلکی ادبی تفریح" اور دل و دماغ کے لئے "صالح اثر"!!!

ہم اردو زبان کے ان اہل قلم سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس نازک زمانہ میں جب کہ اردو کے وجود پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں اتنی تو عنایت کریں کہ اس "ہلکی پھلکی ادبی تفریح" کی پھانسی کا پھندا اس زبان کے گلے میں نہ ڈالیں جسکی گود میں ادب اور آرٹ کی عظیم الشان روایات نے پرورش پائی ہے ـ اردو کے ایسے اڈیٹروں اور ادبی گندگی کے ان بیوپاریوں سے ہم سوائے اسکے کیا عرض کریں کہ

مرا بخیر تو امید نیست بد مرسان!

ادب میں فحاشی

[مرغوب صدیقی ـ ایم ـ اے ـ ایل ایل بی]

پنجاب یونیورسٹی نے جب کسی کی تحریک پر اردو کے بعض شعرا کے کلام کو نصاب تعلیم سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا تو سینیٹ میں یہہ سوال زیر بحث آیا کہ ادب میں "فحاشی" کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ سینیٹ کے ارکان کو اصرار تھا کہ ان کو "سیفٹی ایکٹ" کے اختیارات تفویض کئے جائیں تاکہ وہ جس کتاب کو "ناپسندیدہ" خیال کریں آسانی سے نصاب سے نکال دیا جائے ـ دیال سنگھہ کالج کے پرنسپل سید عابد علی عابد نے تجویز پیش کی کہ پہلے "فحاشی" کا مفہوم متعین کرنے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی کا تقرر عمل میں لایا جائے ـ

لیکن وہ سینیٹ کے ارکان کو اس تجویز کی معقولیت کا قائل نہ کرسکے اور نتیجہ یہہ ہوا کہ سنڈیکیٹ نے متنازع فیہ تصانیف کو اس سفارش کے ساتھ "بورڈ آف سٹڈیز" کے حوالہ کردیا کہ وہ قانون کی بجائے "وجدان" سے کام لیتے ہوئے اپنا فیصلہ صادر کریں ــــ!

اس اقدام سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری قوم میں "عقلیت پرستی" کا جنون کس حد تک ترقی کرچکا ہے؟ جب ماہرین تعلیم کا یہہ حال ہے کہ وہ "فحش" اور غیر فحش" ادب میں حد فاصل کھینچنے کے لئے ایک ایسے بورڈ کی آمرانہ رائے پر انحصار رکھتے ہیں ـ جس میں طرح طرح کے متضاد رجحانات کا اجتماع ہے تو اگر عام لوگ صحیح راستہ سے بھٹک جائیں تو اس میں کیا تعجب ہو سکتا ہے؟

پاکستان کو قائم ہوئے ابھی صرف پانچ برس گذرے ہیں اگر وہ عالم طفولیت ہی میں "ذہنی فالج" کا شکار ہو چکا ہے تو اس کے یہہ معنی ہیں کہ اس کی اخلاقی اور تعلیمی نشوونما کو بہت بڑا خطرہ درپیش ہے ـ جس کے انسداد کے لئے پاکستان کے تمام ہوشمند عناصر کو یکجا ہو جانا چاہئیے ـ ابتدا میں ہر "معاشرتی عضویہ" (جس میں قوم بھی شامل ہے) عمل اور رد عمل کے جدلیاتی طریقہ سے ترقی پاتا ہے ـ اس کے بعد جب وہ سیاسی اور ذہنی بلوغ کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے لئے ترقی کی تمام راہیں خود بخود کشادہ ہو جاتی ہیں اور قوم میں بنیادی وحدت خیال اور وحدت تصور نظر آنے لگتی ہے ـ لیکن جدلیاتی عمل کو بعض مخصوص مقاصد کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنا چاہئے ورنہ اگر لوگ متضاد نظریوں اور متناقض خیالوں سے آکتا کر مختصر راہیں ڈھونڈنے پر آمادہ ہو جائیں یا اہم مسائل ـ اپنی مرضی کے مطابق رائے دینے لگیں تو نہ صرف ارتقا رک جائے گا ـ بلکہ ایک ایسی بدنظمی پیدا ہوگی اور ایک ایسا اختلاط عمل میں آئے گا جس کو قوم کی اجتماعی قوت کی شیرازہ بندی ہی کے ذریعہ سے دور کیا جاسکتا ہے ـ

اگر اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو پنجاب یونیورسٹی سینیٹ میں سید عابد علی عابد کی تجویز کا استرداد بعض خوفناک نتائج کا آئینہ دار ہے ــــ!

اول تو پنجاب یونیورسٹی کی سینیٹ نے مولانا حسرت موہانی ایسے مفکر شاعر کو مصحفی ایسے غیر مفکر شاعر کی سطح پر رکھہ کر بد مذاقی کا ثبوت دیا ہے ـ مولانا حسرت موہانی نہ صرف امام المتغزلین ہیں بلکہ ان کا شمار انقلاب ۱۸۵۷ع کے بعد اُردو کے تین سب سے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے بھلا مصحفی کا ان کے ساتھہ کیا مقابلہ، حسرت موہانی اُردو کے پہلے مشہور غزل گو شاعر ہیں جن کی بلند کرداری کی جھلک ان کے کلام میں بھی نظر آتی ہے ـ انہوں نے ایرانی روایات سے بغاوت کی اور عام شاعروں کی طرح اپنا موضوع سخن کسی حسین و جمیل لونڈے کو نہیں بنایا ان کے کلام میں انسانی جذبات و احساسات کی صحیح ترین ترجمانی کی گئی ہے ـ ان کی توجہ زیادہ تر ازدواجی محبت پر مرکوز رہی لیکن اس معاملہ میں بھی انہوں نے اخلاق و قانون کی حدود سے تجاوز نہیں کیا ـ حتی کہ پٹنہ کے پروفیسر کلیم الدین احمد بھی جنہوں نے اپنی تصنیف "اُردو شعرا پر ایک نظر" میں کسی شاعر کو معاف نہیں کیا ـ تسلیم کرتے ہیں کہ حسرت موہانی کی شاعری میں "ہوس" کا شائبہ تک نہیں ہے اور ان کی محبت کا تصور بہت پاکیزہ ہے ـ لیکن ستم ظریفی دیکھئیے کہ جس غزل کی روشنی میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے یہہ نظریہ قائم کیا ہے اسی کی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی سینیٹ حسرت کے کلام کو نصاب تعلیم سے خارج کرنے کے درپے ہے ـ اس غزل کا مطلع یہہ ہے ـ

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانا یاد ہے

حسرت موہانی نے اس غزل میں پہلی مرتبہ عاشقانہ جذبات کی صحیح ترین ترجمانی کی ہے لیکن اسکے باوجود اگر اسے "فحش" قرار دیا جا رہا ہے تو اس کے یہہ معنی ہوئے کہ ابھی اردو شاعری پر سے اس "اخلاقی بداطواری" کا الزام دور نہیں ہو سکا جو مغربی قدروں نے ۱۸۵۷ع کے انقلاب کے بعد اس پر ڈالا ـ! قیام پاکستان کا مطلب بعض اوقات غلط طور پر یہہ لیا جاتا ہے کہ ہمیں مغربی آزاد روی کے مقابلہ میں ملائیت اور مشرقی رجعت پسندی کو ازسرنو زندہ کرنا ہے چنانچہ اسی جنون کے ماتحت بعض عناصر اس تہذیبی سرمایہ کو تباہ کرنے کے درپے ہیں جو بے اندازہ مصیبت

اور محنت مول لینے کے بعد گزشتہ کئی برس میں فراہم کیا گیا اور آسکی جگہ وہ ایک ایسا مذہبی نظام قائم کرنے پر تلے بیٹھے ہیں جو انتہائی تعصب اور احساس کمتری پر مبنی ہو اس "رجعت قہقہری" کے اسباب معلوم کرنا دشوار نہیں ہے۔ دراصل جو نعرے ہندو اور مسلمان لیڈروں نے غیر ملکی استبداد کے خلاف بلند کئے وہ حصول آزادی کے فوراً بعد بے معنی ہو گئے بد قسمتی سے چونکہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں کا کوئی مثبت معاشی نظریہ نہیں تھا اس لئے وطن پرستی کے ایک کھوکھلے جذبے نے اس کی جگہ لے لی۔ اس وطن پرستی نے پاکستان میں تو انگریز دشمنی اور ملازمت کے ہتھیار سنبھال کر مغربیت اور تجدد پسندی کے خلاف اعلان جہاد کر دیا۔ لیکن بھارت میں اس نے ہندو اکثریت کو مسلمان اقلیت کے خلاف اکسایا۔ بہر حال وطن پرستی نے دونوں ملکوں میں ایک ہی راہ اختیار کی اور وہ ہے رجعت پسندی کی۔ یہی وہ ہتھیار ہے جس کے ذریعہ سے ادب اور زندگی میں بھی "اعتدال" کو چیلنج کیا جا رہا ہے ـــــ!

اس میں شک نہیں کہ اخلاقی پابندی سے فن کار کی تخلیقی ذہانت فنا ہو جاتی ہے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں اگر قوم کی ذہنی نشو ونما کو صحت مند رکھنا مقصود ہو تو اس پر کوئی نہ کوئی پابندی ہر حالت میں عائد کرنا ہو گی۔ تاہم یہ بھی خیال رہے کہ اگر اس پابندی کو ہتھیار بنا کر متعصب طبقہ کے ہاتھ میں محض اس لئے دے دیا جائے کہ وہ دانش وروں کو اذیت پہنچائیں تو اس کے نتیجہ میں قوم ایک ایسے "ذہنی فالج" میں مبتلا ہو جائے گی جو "اخلاقی انحطاط" سے بھی کہیں زیادہ ہلاکت انگیز اور تباہ کن ہے۔ اگر کوئی قوم اخلاقی انحطاط کا شکار ہو جائے تو وہ اپنے ذہن و شعور کی بنا پر دوبارہ ابھر سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ ذہنی فالج میں مبتلا ہو جائے تو اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ کوئی غیر ملکی طاقت اگر اس پر قابض ہو جائے اور اسے ایک یا دو صدیوں کی مسلسل محنت کے بعد از سر نو اصلاح و ترقی کی راہ پر ڈال لے۔ کسی قوم کو ذہنی فالج میں مبتلا کرنے کا آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ اسے اقتدار و حکومت کے اشاروں پر بلا چون و چرا چلنے پر مجبور کیا جائے۔!

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ ملٹن کو جو شاہ پرستوں کے خلاف جمہوریت پسندوں کے پراپیگنڈے کی لڑائی لڑتا رہا کچھ عرصہ کی خانہ جنگی کے بعد "احتساب و نگرانی" کے خلاف قلم اٹھانا پڑا اور اس نے ذہنی آزادی کی تائید میں اپنی مشہور کتاب "Aera Pagetica" لکھی ملٹن نے جس احتساب کی مخالفت کی اس کا مقصد قوم کے ذہن کو فحاشی سے محفوظ رکھنا ہی تھا۔ ملٹن نے لکھا کہ حکومت کو قوم کے لئے "ذہنی نسخہ" تجویز کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ کیونکہ اس "سرپرستی" سے اگر ایک طرف پڑھنے والے کی قوت امتیاز مساب ہو جائے گی۔ تو دوسری طرف عوام میں بلا وجہ تجسس پیدا ہو گا اور وہ خواہ مخواہ فحش ادب پڑھنے کا شوق ظاہر کریں گے ملٹن نے لکھا کہ اگر حکومت قانونی ممانعت کے ذریعہ سے فحش تحریر کو "شہادت" کا درجہ نہ دے تو وہ کچھ عرصے کے بعد خود بخود فنا ہو جائے۔

ملٹن کا یہ نقطہ کس حد تک صحیح تھا؟ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ڈی۔ ایچ لارنس اور جیمز جائس کے خلاف قانونی کارروائی نہ کی جاتی تو ان کے ناول اتنے مقبول نہ ہوتے۔ اس کے مقابلہ میں اگر شکسپیئر کے ڈرامہ (Measure for Measure) کو ممنوع قرار دے دیا جاتا تو وہ اتنا گمنام ثابت نہ ہوتا جتنا اب ہو رہا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اس ڈرامے میں جو فحش کلمات استعمال کئے گئے ہیں وہ خواہ کتنے ہی قابل مذمت ہوں۔ لیکن ان کی بنا پر پورا ڈراما فحش نہیں ہے۔

ملٹن انگریزی ادب کا "اخلاق بادشاہ" ہے اس نے اپنی مشہور نظم "گمشدہ جنت" میں آدم اور حوا کو بالکل عریاں حالت میں ملاقات کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس کے باوجود ملٹن کو آج تک کسی نے فحش نگار نہیں کہا دراصل بات یہ ہے کہ اس نظم کا ماحول ہی اتنا پاکیزہ اور معصوم ہے کہ اس کو کسی اخلاق نقطۂ نگاہ سے جانچنا خود اخلاق کا مذاق اڑانا ہے۔ اس کے علاوہ ملٹن کی "صالحیت"۔

--- جس کا تصور حسرت موہانی کی "پاکیزگی سے ملتا جلتا ہے -- آدم و حوا کے منظر کو اتنا سنجیدہ بنا دیتا ہے کہ پڑھنے والا خود بخود ملٹن کے "تقویٰ و طہارت" سے مرعوب ہوجاتا ہے اور وہ شاعرانہ فن کاری کے اخلاق پہلو پر گفتگو کرنے کی جرات ہی نہیں کرسکتا۔

غرض ملٹن نے فحش اور غیر فحش ادب میں تمیز کرنے کے لئے جو معیار قائم کیا ہے اس کا آج تک جواب نہیں ہوسکا۔ اس معیار کے مطابق فحش ادب وہ ہے جو پڑھنے والے کو بھی گناہ و معصیت کی ترغیب دے اگر کوئی تحریر اس ترغیب سے عاری ہے تو خواہ اس میں کتنے ہی سفلی جذبات اور خفیہ باتوں کی ترجمانی کی گئی ہو۔ اسے "فحش" نہیں کہا جاسکتا۔ مثال کے طور پر قرآن مجید، احادیث اور فقہ میں بھی بعض "افعال ممنوعہ" کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن اس کا مقصد چونکہ اصلاح ہے اس لئے کوئی شخص اسے "فحش" کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا ہے اسی طرح علم الحیات اور علم الطب میں ان افعال کا تفصیل سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ "بد اخلاق" کے تحت نہیں آتا۔ یہی حال "ادب" کا ہے ادب میں بھی محض کسی فعل کا تذکرہ اس وقت تک فحش نہیں کہلا سکتا جب تک اس کا مقصد گناہ کی ترغیب نہ ہو۔ مثلاً ایم۔اے میں جب میں نے شکسپیئر کے ڈراما Measure for Measure میں ذیل کی سطور پڑھیں تو مجھے بیحد صدمہ پہنچا:-

Your brother and his lover have embrac'd
As those that Feed grow full
as blossoming time
That from the seedness the follow brings.
To teeming Foison even so her Plenteous
Womb
Expresseth his full tilth and Husbandry.

اس ڈرامہ میں اس سے بھی زیادہ فحش اشعار موجود ہیں باایں ہمہ یہ ڈراما کہیں بھی ممنوع نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ اس ڈرامے کا انسانی ذہن (خصوصاً عورتوں پر) جو بصیرت افروز اثر ہوتا ہے وہ انگریزی کے کسی ڈرامے میں بھی موجود نہیں ہے۔ اس ڈرامے میں ایک ایسی بیکس و مجبور عورت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جو گناہ و عصیان کے اس دام میں پھنسنے سے انکار کر دیتی ہے جو معاشرے کے بدنام عناصر اس کے سامنے پھیلاتے ہیں وہ "عصمت" کو بھائی کی جان سے بھی عزیز خیال کرتی ہے اور دنیا کی ہر مصیبت کو مول لینے پر آمادہ ہوجاتی ہے۔ لیکن گوہر عصمت کو کسی قیمتاً پر بھی فروخت نہیں کرتی۔

شیکسپیئر ازابل کے تقدس کو اس وقت تک نمایاں نہ کرسکتا تھا۔ جب تک وہ لیوشیو کی بدکرداری کو پوری طرح واضح نہ کرتا۔ انگریزی ادب میں کسی شخص نے بھی "نسائیت" کو وہ اعلیٰ صفات عطا نہیں کئے جو شیکسپیئر (یا زیادہ سے زیادہ سپنسر) نے عطا کئے ہیں۔ البتہ سپنسر کی ادنا چونکہ "انسانی کردار" کی بجائے "فلسفہ کی علامت" زیادہ نظر آتی ہے۔ اس لئے وہ "فیری کوئین" پڑھنے والے کے دل میں اخلاقی احساسات پیدا نہیں کرسکتی۔ اس کے مقابلہ میں شیکسپیئر کی ازابل میں چونکہ وہ تمام کمزوریاں موجود ہیں جو گوشت پوست کے پتلے میں پائی جاتی ہیں اس لئے جب اسے ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو دل سے ہمدردی کی ایک ہوک اٹھتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ تاثر اس وقت تک پیدا نہ کیا جاسکتا تھا جب تک لیوشیو کو اس انداز میں پیش نہ کیا جاتا جس میں شیکسپیئر نے اسے پیش کیا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نیکی کے اظہار کے لئے ایک نہ ایک لیوشیو کی ضرورت ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب بھی کوئی ڈراما نویس ایسا کرنا چاہے تو اس کی کوشش کو فحاشی یا بد اخلاقی پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔

جمالیات کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ فنی تخلیق کو --- خواہ وہ واقعیت پسندانہ ہو دنیا کے حقائق کی ترجمانی ایک ایسے انداز میں کرنی چاہئے کہ اس سے آتش احساس تیز ہوجائے۔ قدرتی طور پر اس سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ فن کو اس "اخلاق ضابطہ" سے پرکھنا صحیح نہیں جو انسانی کردار کو جانچنے کے لئے مخصوص ہے۔ چونکہ آتش احساس کو اس وقت تک تیز نہیں کیا جاسکتا جب تک حیات انسانی کے انوکھے اور غیر معمولی پہلوؤں کی نقاب کشائی نہ کی جائے اس لئے اگر کسی فن پارے سے ایک

عام آدمی کے اُس تصور اخلاق کو صدمہ پہنچتے جس کا مقصد انسان اور معاشرے کے تعلقات کو برقرار رکھنا ہے تو اس پر تعجب نہیں ہو سکتا۔ اگر فن میں "آتش احساس" کی جھلک نہ ہو تو اُس کا بنیادی مقصد ہی۔ خواہ وہ ذہنی آسودگی ہو یا ذہنی ترقی فوت ہوجاتا ہے غرض فن کا مقصد خواہ کچھ ہی ہو وہ چونکہ انسانی ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر وہ ایک عام انسان کے تصور اخلاق سے بھی متصادم ہوسکتا ہے اور اس تگ و دو میں بہت ممکن ہے کہ اُس کے اثرات اُس خطہ ممنوعہ تک جا پہنچیں جسکو عام اصطلاح میں "فحش" کہا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے فن کا حقیقی تصور ہی فحاشی کی اُس تعبیر کے منافی ہے جو عوام کے ذہن میں ہے۔

فن ادب اور خصوصاً شعر کی چونکہ بعض مخصوص حدود ہیں اس لئے "پلاسٹک آرٹ" (مثلاً مجسمہ سازی اور سنگ تراشی) کے مقابلہ میں وہ نسبتاً فیاضانہ سلوک کی مستحق ہے۔ مثال کے طور پر سنگ تراشی میں اگر اخلاقی تقاضوں کے ماتحت جسم کے کسی خاص حصے کو نمایاں کرنا ممکن نہ ہو تو اُسے "پس پردہ" رکھا جاسکتا ہے لیکن شعر میں چونکہ تمام الفاظ یکساں طور پر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس لئے اخلاقیات کا تقاضا اسی صورت میں پورا ہوسکتا ہے کہ ناپسندیدہ الفاظ" کو مطلق استعمال نہ کیا جائے۔ کیونکہ الفاظ کو "پس پردہ" رکھنا ممکن نہیں۔ اسی دقت نے شاعری میں "واشگاف" اور "مثبت" طرز بیان کی بجائے "اشاریت" اور "ابہام" کو جنم دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "مواد" اور "ساخت" دونوں لحاظ سے "شاعرانہ کوشش" کا مقصد انسانی زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی ترجمانی کرنا نہیں ہوتا بلکہ اُس کے 'اضافی' اور "مبہم" پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے۔ اسی بنا پر رزمیہ کے سوا تمام اعلیٰ شاعری کا مواد، افعال پر نہیں، احساسات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر اس اصول پر سختی سے عمل کیا جائے تو شاعرانہ اخلاق' — عام اخلاق نہیں — خود بخود پیش نظر رہتا ہے لیکن اگر اس اصول پر کاربند رہنے کے باوجود کسی شاعر کی تخلیق' ملامت و مذمت سے محفوظ نہ رہ سکے تو اس میں شاعر اور اس کی اخلاق قدروں کا قصور نہیں۔ بلکہ نقاد کا ہے۔ اس کے علاوہ اس قسم کے نقد و تبصرہ کا ہدف نشانہ کوئی خاص تخلیق نہیں بلکہ پوری شاعری ہوگی۔ ایسے حالات میں شاعر کو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اُس کے اطمینان قلب کے لئے صرف اپنا خلوص فن ہی کافی ہے بایں ہمہ اگر کوئی شخص پنجاب یونیورسٹی کی سینیٹ کے ارکان کی طرح "ماہر تعلیم" ہونے کا دعوی کرتے ہوئے بھی ان حقائق سے بے خبر ہے تو اُس کی ذہنیت پر ماتم کئے بغیر کیا چارۂ کار ہے؟

"مواد اور ساخت کی پابندیوں کے علاوہ فنی تخلیق کا مقصد یہی شاعر کو زندگی کا عام اور ظاہری حقیقتوں کے قریب آنے سے اتنا روکتا ہے کہ اُس پر اخلاقی نقطہ نگاہ سے اعتراض کرنا بھی آسان نہیں رہتا۔ اگر ایک فن کار ہر شعر پر یہہ سوچنے لگے کہ کہیں یہہ اخلاقیات کے عام تصور کے منافی تو نہیں ہے تو شاید وہ ایک غزل یا نظم بھی مکمل نہ کرسکے۔ اس کے علاوہ اُس کی شاعری بے روح اور بے کیف ہوجائے گی اور اُس کا نہ تو کوئی مقصد رہے گا نہ وہ پڑھنے والے کی ذہنی تربیت میں حصہ لے سکے گی۔ اس قسم کی غیر فنی کوشش "قافیہ بندی" تو کہلاسکتی ہے لیکن اُسے "شاعری" نہیں کہا جاسکتا۔ ارسطو اپنی تصنیف Poetica میں "قافیہ بندی" اور "شاعری" کے فرق کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"اگر طب یا فلسفۂ طبعیات کو بھی کوئی شخص قافیہ و بحر میں لکھے تو اُسے شاعر کہا

جائے گا۔ تاہم ہومر اور امپیڈوکلز میں قافیہ وبحر کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ اگر ان میں سے ایک کو اگر شاعر کہا جائے گا۔ تو دوسرے کو طبیب ہی کہنا مناسب ہے"۔

لیکن جو لوگ ارسطو کے اس نظریہ سے اختلاف رکھتے ہیں وہ اردو شاعری کو ہمدرد دواخانہ کے "شربت روح افزا" کا اشتہار بنا کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ انہیں بے شک اس بے ہودگی کا ارتکاب کرنے کا پورا اختیار ہے۔ لیکن انہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس بیہودگی کو ان طالب علموں کے دماغ میں بھی ٹھونسنے کی کوشش کریں جن کی ذہنی تربیت پر ہی ملک و ملت کے مستقبل کا انحصار ہے!

جو بات شاعری پر صادق آتی ہے وہ ناول اور ڈرامے کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ شاعری کے مقابلہ میں ڈراما نویس کو کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شاعر تو "ابہام" و "اجمال" سے بھی کام لیکر فحاشی و عریانی سے گریز کر سکتا ہے لیکن ڈراما نویس کے لئے یہ ممکن نہیں کیونکہ اگر وہ ایک بھی لفظ زاید یا غیر ضروری یا مبہم لکھہ جائے تو اس کا اثر پلاٹ کے تانے بانے پر پڑتا ہے اسی طرح کردار نگاری کے وقت وہ محض اشارا و کنایہ پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ بلکہ اسے کسی کردار کو ابھارتا ہے تو اسے افعال و رجحانات کی اتنی چاشنی دینا ہوگی کہ اس کی تمام خصوصیات نمایاں ہو جائیں اور کردار کوئی "فرد واحد" نہ رہے بلکہ ایک "نوع" بن جائے۔ مثال کے طور پر اگر ڈراما نویس "بدمعاش" کا کردار پیش کرتا ہے تو اس کے اعمال دیکھہ کر ایک عام شخص کے ضمیر میں دھماکہ سا پیدا ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اگر اس کا کردار کوئی "شریف انسان" ہے تو اسے کبھی نہ کبھی بدمعاش کی سازشوں کا شکار ہونا چاہیئے۔ جس ڈرامے کے ہر گوشہ میں نیکی پائی جائے وہ مصنوعی رنگ آمیزی کے سوائے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ لیکن ظاہر ہے اس صورت میں "ڈرامائیت" باقی نہیں رہے گی۔ اس کے علاوہ روحانی ڈراموں کی جان ہی وہ شاعرانہ جذبات ہوتے ہیں جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی سینیٹ کے ارکان کو صدمہ پہنچایا ہے!

اسی طرح اس ناول نویس کا کام بھی آسان نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کسی شخص کی خارجہ حرکات کا غور سے مطالعہ کرے۔ اس کے انکم ٹیکس اور بیمہ کے حساب کتاب کا جائزہ اور پیدائش سے موت تک اس کی تمام سرگرمیوں کا کھوج نکالے۔ لیکن وہ اسے ناول کا موضوع بنانے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اس کی امید و بیم، تمنا و آرزو، اور مسرت و غم کا مطالعہ نہ کرے اسے بتانا ہوگا۔ کہ اس کے کردار کے سینے میں کونسی آرزوئیں کروٹیں لے رہی ہیں وہ آدمی رات کے وقت اپنے دل سے کیا باتیں کیا کرتا ہے؟ اسے کونسی تکلیف ہے جسے وہ پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے اور وہ کس سے ڈرتا ہے؟ یا کس سے محبت کرتا ہے؟ لیکن ظاہر ہے جب ایک ناول نویس ان تمام باتوں کو "مواد" کے طور پر استعمال کرے گا تو وہ کسی نہ کسی "اخلاقی ضابطہ" کو ضرور توڑے گا۔ ان حالات میں فن کار پر اخلاقیات کے ان اصول کا اطلاق کیسے ہو سکتا ہے جو ایک آدمی نے اپنے ذہن میں وضع کر رکھے ہیں؟ اس سوال کا جواب ان ارکان کو دینا چاہیئے جنہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی سینیٹ میں بیٹھہ کر حسرت موہانی کے اچھے بھلے کلام کو فحش قرار دے کر اسے نصاب سے خارج کرنے کا مشورہ دیا۔

(شکریہ کے ساتھہ منقول از عالمگیر)

باہتمام عزیز حسین منیجر نیشنل پریس کمپنی میں چھپا اور قاضی عبدالغفار صاحب پبلشر نے صدر دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڈھ سے شائع کیا۔